پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

قرآنی فکرِ فراہی میزانِ شبلی میں

علامہ شبلیؒ نے اجلاس ندوۃ ۱۸۹۴ء کو "علماء کے فرائض" پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"ہم اختلاف و اتفاق کو اصل حدود پر نہیں رہنے دیتے۔"[1]

اس سے پہلے انھوں نے صحابۂ کرامؓ اور سلفِ صالحین کے اختلاف و اتفاق کے حدود کا تعین کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کا اختلاف و اتفاق خدا ترسی، دیانت اور علمی رویہ پر مبنی ہوتا تھا۔ موجودہ مسلم معاشرہ کا عام روگ اور علماء کرام کا خاص المیہ یہ ہے کہ وہ اتفاق پر آتے ہیں تو پھر ہر چیز سے۔ خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی، غیر دینی اور غیر اخلاقی کیوں نہ ہو، درگزر کر دیتے ہیں، اور اگر اختلاف کرنے پر آجائیں تو اسے ناقابلِ معافی مخالفت کا رنگ و آہنگ دے دیتے ہیں، حالانکہ بسا اوقات اس اختلاف کی پُشت پر صرف نجی رنجش، مسلکی عصبیت، اداراتی یا مدرسی تعصّب اور غیر علمی اور غیر دینی حساسیت کار فرما ہوتی ہے۔ افراط و تفریط کا یہ رجحان اور عدم اعتدال و توازن کا یہ میلان پیش رو مصنفین و مؤلفین کے کاموں اور کارناموں کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر علماء کرام اور دوسرے صاحبانِ علم و قلم کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔[2] علامہ شبلیؒ کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اختلاف و اتفاق کے حدود کو صحیح طور پر جانتے اور پہچانتے تھے، بلکہ ان کو ان کے حدود کے اندر قائم بھی رکھتے تھے۔ مولانا حمید الدین عبد الحمید الفراہیؒ کی قرآنی تحقیقات کے بارے میں بھی ان کا طریقہ مثبت اور خالص علمی تھا۔ ان کی تشریحات و تعبیرات اگر علامہ شبلیؒ کے معیارِ نقد و علم پر پوری اترتی تھیں تو وہ ان کی دل کھول کر تحسین و تعریف کرتے تھے، اور اگر وہ ان کے معیار پر کھری نہیں اترتی تھیں تو وہ نہ صرف

ان پر نقد کرتے تھے بلکہ مولانا فراہیؒ کو متوجہ اور متنبہ بھی کرتے تھے۔ اس مختصر مقالہ میں تحقیقاتِ فراہی سے متعلق علامہ شبلیؒ کی تحسین و تعریف اور تنقید و تبصرہ کا ایک علمی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

الف۔ تحسین و تعریف

مولانا فراہی مرحوم سے علامہ شبلیؒ کی الفت و محبّت اور تعلقِ خاطر کے کئی اسباب تھے، جن کی وجہ سے وہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ علامہ مرحوم کے ماموں زاد بھائی تھے، قریبی رشتہ کے علاوہ وہ ان کے شاگردِ رشید تھے، اور شاگردِ رشید تھے، اور سب سے بڑھ کر وہ جوہرِ قابل تھے جن سے علامہ مرحوم کو بہت سی توقعات تھیں۔ وہ مولانا فراہیؒ کی طالب علمی کے زمانہ سے ان کی قابلیت و صلاحیت کے قدر دان اور معترف تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج میں ان کے داخلہ کی کوشش کی، اور ان کی فارسی و عربی دانی اور علم و فضل کی سرسید مرحوم اور کالج کے اساتذہ سے اتنی تعریف و تحسین کی کہ جس پر دانشورانِ کالج کو حیرت و استعجاب کے ساتھ کبیدگی بھی ہوئی تھی۔

مولانا فراہیؒ سے علامہ شبلیؒ کا غیر معمولی تعلق دراصل ان کی عظیم صلاحیتوں کی وجہ سے تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرتِ سلیمہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا فراہیؒ کی نادر علمی تحقیقات جب منظرِ عام پر آتیں تو وہ ان کی بھرپور تعریف و تحسین کرتے، تقاضا کر کے ان کی نئی تحقیقات منگواتے، خود پڑھتے اور دوسروں کو روشناس کراتے، اور ان کے امتیازی خصائص کو منظرِ عام پر لاتے، جیسے کہ ان کی کتابوں نظام القرآن" "جمهرة البلاغة" پر رسالہ الندوہ میں اپنے ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ شاندار تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا کہ:

"یہ تصنیف (خصوصاً اس زمانہ میں) اسلامی جماعت کے لیے اسی قدر مفید اور ضروری ہے، جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جاں کے لیے آبِ زلال۔"[3]

اس کے بعد نظمِ قرآن کی تعریف و اہمیت، اس موضوع پر قدماء کی آراء، خاص کر شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے ہمنوا علماء کا ذکر کیا ہے جو نظمِ قرآن کے منکر ہیں۔ پھر بقاعی کی تفسیر نظم الدرر

فی تناسب الآیات والسور اور نظمِ قرآن کے قائل بعض علماء کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر مولانا فراہی کی تقریر اور دلائل کا مختصر ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''مولوی حمید الدین صاحب نے اسی مسئلہ پر یہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اسی اخیر رائے کے مدعی ہیں، یعنی یہ کہ ایک سورہ میں جس قدر آیتیں ہیں، ان میں ضرور کوئی قدرِ مشترک ہے، اور اس لحاظ سے وہ سب آیتیں باہم متناسب ہیں۔ . . . اس بنا پر مصنف نے تمام سورتوں میں تناسب کا دعویٰ کیا ہے، اور نہایت دقتِ نظر سے ہر جگہ اس کو ثابت کیا ہے۔

کتاب کا اصل موضوع اسی قدر تھا، لیکن اس بحث کے ضمن میں قرآن مجید کی وضاحت و بلاغت کی بحث بھی آگئی ہے۔ مصنف ان کتابوں سے واقف تھا، جو قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس کو نظر آیا کہ یہ تمام کتابیں ناتمام ہیں۔ . . . اسی بنا پر اصل فن پر توجہ کی، اور اس کو ایک نہایت وسیع پیمانہ پر نئے سرے سے ترتیب اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے جدید اصول قائم کیے۔ اس طرح ایک اور مستقل کتاب تیار ہو گئی جس کا نام انھوں نے جمهرة البلاغة رکھا۔ ۔''[٣١]

اس کے بعد علامہ شبلی نے اس کتاب کی تمہید اور اہم مباحث خاص کر مولانا فراہی کے اصول بلاغت پر پورا مضمون لکھا، اور ان کو پہلی بار اردو زبان میں اہلِ علم سے روشناس کرایا، اور بلاغت کے اصول و قواعد پر آئندہ شمارہ میں بحث کرنے کا وعدہ فرمایا۔[٣٢]

نظمِ قرآن کے ضمن میں مولانا فراہی کی ایک اور بحث اقسامِ قرآنی ہے، جو پھیل کر ایک پوری مستقل کتاب بن گئی اور امعان فی اقسام القرآن کے نام سے شائع ہوئی اور بعد میں وہ اردو میں اقسام القرآن کے نام سے چھپ بھی گئی۔

علامہ شبلی نے ازراہِ علم پروری اور معارف شناسی اس کو بھی الندوہ میں متعارف کراتے ہوئے لکھا کہ :

''مولوی حمید الدین صاحب، جن کا ذکر الندوہ کے ایک پرچہ میں ایک خاص تقریب سے آچکا ہے، قرآن مجید کے حقائق و اسرار پر جو کتاب عربی میں لکھ رہے ہیں، اس کے بعض اجزا آجکل ہم کو ہاتھ آئے۔ ان میں اس مسئلہ پر بھی بحث تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے نہایت محققانہ اور ادیبانہ لکھا ہے۔''[٣٣]

علامہ شبلی نے پہلے قرآن مجید کی قسموں پر مخالفانہ نکتہ چینیوں اور امام رازی وغیرہ کے جوابات اور فلسفیانہ دلائل سے بحث کی ہے، اور اس کے پس منظر مولانا فراہی کی تحقیقات عالیہ کا خلاصہ پیش کر کے اس کے محاسن گنائے ہیں۔[٣٤]

اسی طرح مکاتیبِ شبلی میں جابجا مولانا فراہیؒ کی قرآنی تحقیقات کی داد و تحسین ملتی ہے :

مکتوب نمبر ۱۷، مورخہ ۹ مارچ ۱۹۰۳ء میں حیدر آباد سے مولانا فراہی کو لکھتے ہیں :

''نظام القرآن کا میں شوق سے خیر مقدم کروں گا۔ ابو مسلم ہی ایک (ایسا) شخص ہے جو دل و دماغ رکھتا ہے۔ وہ معتزلی ہے۔ اس کی تفسیر بارہ جلدوں میں تھی، اور رازی کی تفسیر سے پہلے اسی کا نام کبیر تھا۔ . . .''[٣٥]

مکتوب نمبر ۱۸ میں پھر نظام القرآن کو شوق سے دیکھنے اور اس پر معتدبہ وقت صرف کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔[٣٦]

مکتوب نمبر ۱۹ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۰۳ء میں پھر لکھتے ہیں :

''نظام القرآن کو اول سے آخر تک دیکھا، عبارت اور طرزِ کلام کی خوبی میں کلام نہیں۔''[٣٧]

مکتوب نمبر ۲۰ مورخہ یکم جون ۱۹۰۲ء میں تحریر کرتے ہیں :

''پہلی مرتبہ ہندسوں کا کچھ مطلب سمجھ نہ سکا، اس مرتبہ تمہاری ہدایت کے موافق قرآن مجید پر ہندسے لگائے، اور پھر نظام القرآن کے اجزار کو دیکھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب کی زیادہ وجوہ ربط معلوم ہوئے۔ . . تاہم مجموعی طور سے یہ کوشش بے سود نہیں۔ المنار میں ضرور بھیج دو۔ . . .''[٣٨]

مکتوب نمبر ۲۱ جو مولانا فراہی کے خط کے جواب میں ہے، اس میں لکھتے ہیں :

"ہاں، اب یہی کروں گا، یعنی قرآن کو بلحاظ ربط آیات دیکھوں گا، اور پھر تم کو اطلاع دوں گا۔"[9]

مکتوب ۲۸، مورخہ ۲ جون ۱۹۰۵ء میں داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تفسیر سورۂ ابی لہب اور جمہرۃ البلاغہ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہیے۔ . . . ارسطو کا رد البتہ قابلِ قدر ہے۔ میں الندوہ میں اس کا اقتباس درج کروں گا۔ . . ."[10]

مکتوب ۳۳، مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۰۶ء میں ہے:

"بواپسی ڈاک جو اجزا حقائق قرآنی سے تعلق رکھتے ہیں، بھیجدو۔ یوں بھی ان سے کام ہے۔"[11]

جب کہ مکتوب ۳۵، مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۶ء میں ایک دلچسپ توارد کا ذکر کیا ہے:

"سورۂ قیامت کی تفسیر دیکھی۔ لا کے باب میں توارد ہوا۔ میرا مدت سے یہ خیال تھا۔ یہ محاورہ عام ہے۔"[11]

مکاتیب شبلی کے مرتب و محقق گرامی علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ہے:

"قرآن مجید میں اکثر واوِ قسم سے پہلے "لا" آتا ہے۔ عام مفسرین اس لا کو ہمیشہ زائد لکھتے ہیں۔ یعنی اس کو معنی میں کوئی دخل نہیں۔ مولانا کی رائے تھی، جو محاورہ کے بالکل مطابق ہے، کہ اس لا سے خصم کے دعوی کی نفی، اور قسم سے اپنے دعوے کی تائید مقصود ہے۔ عربی میں لا واللہ، لا ورب الکعبہ عام بول چال ہے۔ اردو میں بولتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم۔ "نہیں" بیکار نہیں ہے۔ اس سے مخاطب کی تردید مقصود ہے۔"[11]

مکتوب ۳۶، مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں "اجزائے تفسیر واپس" کرنے کی بات لکھتے ہیں[12] اور مکتوب ۳۷، مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ندوہ کے دو ہوشیار اور مستعد طلبا کو "تفسیر القرآن مصنفہ خود" پڑھانے کی ہدایت کرتے ہیں۔[12] پھر کافی مدت کے وقفہ کے بعد مکتوب ۵۶، مورخہ ۲۶ اکتوبر

۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں کہ:

"سورۂ تحریم کی تفسیر جو تم نے شائع کی ہے، وہ بھیجدو۔"[13]

اور مکتوب ۶۶ (۱۹۱۳ء) میں تفسیر سورۂ تحریم دیکھ چکنے کا ذکر اور مزید دو نسخوں کے بھیجنے کا مطالبہ ہے۔[14]

مکتوب ۸۴، مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۳ء میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اپنے والد ماجد حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں قربانی سے متعلق تحقیق فراہی کی داد دی ہے:

"قربانی کے مضمون سے اب کام لے رہا ہوں۔ نہایت عمدہ ہے۔"[15]

نگاہِ شبلی میں تحقیقات و افکار فراہی کی جو قدر و منزلت تھی، وہ اس حقیقت سے اور بھی مستند و مدلل ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سیرۃ النبیؐ کی تصنیف میں ان کی تحقیقات سے استفادہ کیا اور کئی جگہ ان کی آرا و دلائل قبول کیے۔ اس سلسلہ میں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی سے متعلق مولانا فراہیؒ کے دلائل، اور خود قربانی کی حقیقت و مفہوم کے تعین کے بارے میں ان کی رائے سب سے اہم ہے۔

مولانا فراہیؒ چونکہ عبرانی زبان کے عالم بھی تھے، اور اصل تورات و دیگر صحف سماوی کا براہ راست گہرا مطالعہ رکھتے تھے، اس لیے علامہ شبلی نے ان سے مکہ/بکہ، فاران، حج کعبہ، مسکنِ ابراہیم، مقامِ قربانی، بحرِ ہاجرہ وغیرہ موضوعات کے بارے میں کتب مقدسہ کے حوالے پوچھے اور جاہلی عربوں کے بارے میں اشعار عرب دریافت کیے اور ان سے اپنی ضرورت و اتفاق کے مطابق سیرت النبیؐ میں کام لیا۔ ایلاء، تخییر اور اعتزال پر علامہ شبلی کی بحثوں میں مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ تحریم کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ علامہ شبلیؒ تحقیقات فراہی کے اوّلیں مداح و قدر شناس تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے نجی خطوط میں ان کی فکرِ قرآنی کی اہمیت کا اعتراف کیا، بلکہ مقالات و تبصروں کے ذریعہ بھی برسرِ عام ان پر تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔[16]

ب۔ تنقید و تبصرہ

بایں ہمہ علامہ شبلی کو تحقیقاتِ فراہی اور خاص کر ان کی فکرِ قرآنی سے جہاں کہیں علمی

اختلاف ہوا، اس کا اظہار بھی انھوں نے برملا کیا۔ لیکن ان کی تنقید علمی اور مبنی برانصاف ہوتی تھی۔ وہ پوری ایمانی دیانت اور اسلامی امانت سے علمی اختلاف کا اظہار کرتے تھے۔ مولانا فراہی کے جواب سے اگر مطمئن ہوجاتے تو وہ اپنی رائے کو واپس لینے کی اخلاقی جرأت بھی رکھتے تھے۔ مگر محض قربت و قرابت اور شاگردی و ہم مسلکی کی بنیاد پر ان کی تحقیق و تفسیر کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے تھے اور نہ یہ ان کے مقام کے مناسب تھا۔ ان کی پہلی علمی دیانت و للّٰہیت تھی جو ان کو تنقید کی جگہ پر تنقید پر آمادہ کرتی تھی، اور تحسین و آفریں کے موقع پر داد و تعریف کے دریا بہا دینے پر اُکساتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ وہ اختلاف و اتفاق کو ان کے اصلی حدود پر رکھنا جانتے تھے۔ اسی لیے ان کے مقالات و مکاتیب میں تعریف و تحسین کے پہلو بہ پہلو افکارِ فراہی پر نقد و تبصرہ بھی ملتا ہے۔ جس کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

الندوہ کے جس شمارہ میں مولانا فراہی کی کتاب نظام القرآن اور جمہرۃ البلاغۃ کا تعارف داد و تحسین سے کرایا گیا ہے۔ اسی شمارہ میں علامہ شبلی، مصنف کے اردو زبان میں علمی کاموں سے گریز کی طرف اشارہ بڑے لطیف لیکن واضح الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

"افسوس ہے کہ مصنف نے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی ہے، اور اس لیے عام لوگ اس سے متمتع نہیں ہو سکتے۔ ہم نے ان سے بار بار کہا کہ اس زمانہ میں جو کچھ لکھنا چاہیے، ملکی زبان میں لکھنا چاہیے، لیکن ان کی قدامت پرستی اردو کی طرف ان کو مائل نہیں ہونے دیتی۔ (اور سچ یہ ہے کہ وہ اردو لکھ بھی نہیں سکتے)" [16]

اس سے قبل انھوں نے مولانا فراہیؒ کے گمنام رہنے پر ان کی اپنی کاوش کو موردِ تنقید سمجھا تھا۔ نیز نظام القرآن جس کے وہ بہت مشتاق تھے، پھر اس پر مفصل تعریفی و تنقیدی تبصرہ شائع کر چکے تھے، خود اس کتاب کے نام سے متفق نہ تھے۔ چنانچہ مکتوب ۱۸ میں مولانا فراہی مرحوم کو لکھتے ہیں:

"لیکن نام بدل دو۔ یعنی الف گھٹا دو۔ جاحظ اور عبدالقاہر نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام نظم القرآن تھا۔ نظام میں ذرا بھدا پن ہے..." [18]

مکتوب ۱۹ میں نظام القرآن کے مواد و موضوع کے بارے میں فرماتے ہیں:

"... لیکن اصل مدعا کی نسبت ابھی کوئی یکسو رائے نہیں دے سکتا۔ جس قسم کا ربط تم بتاتے ہو، وہ بہت وسیع معنوں کے لحاظ سے ہے۔ ایک دقت یہ پڑتی ہے کہ دفعہ وار جو مطالب بیان کیے ہیں، اور ان میں ربط ثابت کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ قرآن کی آیتیں نقل نہیں کیں۔ اس لیے خود قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ایک اور امر یہ ہے کہ تم صرف مرابط چیزوں کو لے لیتے ہو، حالانکہ اعتراض یہ ہے کہ دو مربوط مطالب کے بیچ میں جو غیر متعلق باتیں آ جاتی ہیں، وہ سلسلۂ کلام کو برہم اور غیر منظم کر دیتے ہیں (کذا۔ کر دیتی ہیں)۔ ان کا تعلق اور ربط ثابت کرنا چاہیے۔ بہرحال اور اجزا بھیج دو۔ بہت بڑا کام ہے۔ جس قدر بھی کامیابی ہو غنیمت ہے۔ اس قدر کاوش تم کسی ممکن الحصول کام میں کرتے تو خدا جانے کیا کرتے؟..." [19]

اسی تعریف و تنقید کے ملے جلے لہجے میں مکتوب ۲۰ میں فرماتے ہیں:

"... لیکن جن دو آیتوں میں تم ربط بتاتے ہو، ان کے درمیان میں اور آیتیں آ جاتی ہیں، جو بظاہر ان دونوں سے بے تعلق معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم مجموعی طور سے یہ کوشش بے سود نہیں۔ المنار میں ضرور بھیجو، لیکن ہر شخص کو منہ سے لگانے کی فرمائش نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے حاشیہ پر تمام آیتیں نقل کرنی چاہئیں کہ ساتھ کے ساتھ آدمی دیکھتا جائے۔" [19]

جمہرۃ البلاغۃ میں مولانا فراہی نے جرجانی اور جاحظ پر بحث کی تھی اور بقول مرتب مکاتیب "مولوی حمید الدین صاحب جرجانی کے معتقد نہیں ہیں۔ وہ اس کو صرف لفا سمجھتے ہیں۔ مولانا (شبلی) اس کے بے انتہا معتقد تھے۔ اس خط میں جرجانی کی فضیلت کا بیا مقصود ہے" [20]۔ چنانچہ علامہ شبلی مکتوب ۲۷، مورخہ ۵ اپریل ۱۹۰۵ء میں رقم طراز ہیں:

"جرجانی اور جاحظ کی بحث کو میں نے دیکھا ہے۔ زیادہ تدقیق کے بعد نزاع لفظی رہ جاتی ہے۔ جرجانی صرف یہ کہتا ہے کہ محض صوت اور آواز کوئی چیز

نہیں۔ بلکہ معنی اور معنی کا طریقہ بلاغت ہے۔ ۔ ۔ ۔ جرجانی کو اگر تقلیداً لو تو کُل اہلِ فن
اس کی زلّہ ربائی کو فخر سمجھتے ہیں۔ مطول وغیرہ میں اس کے اقوال بطور وحی کے نقل
کیے جاتے ہیں۔ اسی نے قواعد بلاغت اول منضبط کیے، پھر اس کے نقشِ قدم
پر سب لوگ چلے ہیں۔ ۔ ۔" [۲۰]

جمہرۃ البلاغۃ جس کی علامہ شبلی پہلے بہت تعریف و توصیف کر چکے تھے، اس کے کمزور حصوں پر مکتوب نمبر ۲۸، مورخہ ۳ جون ۱۹۰۵ء میں تنقید کرتے ہوئے لکھا:

"۔ ۔ ۔ بلاغت کے بعض اجزا معمولی اور سرسری ہیں ــ عبارت میں جا بجا
کمزوریاں ہیں۔ تعجب ہے کہ "اِذا" اور "لمّا" کے محلِ استعمال میں فرق نہیں کرتے۔" [۲۱]

مکتوب نمبر ۳۴، مورخہ ۴ اگست ۱۹۰۶ء میں سورۂ والشمس کی تفسیر فراہی پر تنقیدی الفاظ یہ تھے:

"۔ ۔ ۔ والشمس میں کوئی اہم بات نہ تھی۔ بعض جگہ وہم پرستی کی جھلک تھی،
مثلاً حضرت عثمانؓ اور امام حسینؓ کی شہادت کو سبب عذاب قرار دینا۔ اس کو میں نے
تمھاری متاثرانہ طبیعت کا اثر سمجھا اور کچھ تعرض نہ کیا۔ ۔ ۔" [۲۲]

یہ تنقید اُس عالم فاضل اور مؤرخ یگانہ کے قلم سے نکلی ہے جو مولانا فراہی کی قرآن فہمی اور علمیت کا نہ صرف قائل، بلکہ فکری طور سے بہ بانگ دہل حضرت عمرؓ کے باب میں اپنے سُنّی اور حضرت علیؓ کے بارے میں شیعہ ہونے کا اعلان و اظہار کرتا تھا۔ [۲۳]

سیرت النبیؐ کی تالیف کے دوران علامہ شبلیؒ کو قرآن مجید، صحف سماوی، خاص کر تورات و انجیل اور جاہلی عربی شاعری سے متعلق مواد کی بعض مباحث میں ضرورت تھی۔ انھوں نے بلا تکلف مولانا فراہی کو ان کے متعلق کئی مکاتیب میں لکھا، اور ان کے بھیجے ہوئے مواد اور تحقیقات سے اپنی عظیم تالیف میں استفادہ کیا۔ تاہم یہ کورانہ تقلید یا جاہلانہ استفادہ نہ تھا۔ وہ جن تحقیقاتِ فراہی سے مطمئن نہ ہوتے، ان کو نہ صرف مسترد کر دیتے بلکہ نقد و جرح کر کے ان کے کمزور حصوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ جیسے حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے کے بارے میں علامہ شبلی نے تقریباً سارے دلائلِ فراہی کو قبول کرتے ہوئے ان کی ستائش بھی کی، تاہم وہ حضرت اسحٰقؑ کی صغرِ سنّی کی تحقیقِ فراہی سے متفق نہ ہوئے۔ چنانچہ مکتوب نمبر ۵۸، مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء میں

اسی موضوع پر کلام کرتے ہوئے لکھا:

"تم نے حضرت اسحٰق کی صغرِ سنّی سے جو استدلال کیا ہے وہ ناتمام ہے۔ ۔ ۔" [۲۴]

اس کے بعد تورات میں مذکور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحٰقؑ کی باہمی عمروں کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"۔ ۔ ۔ میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ قربانی کے وقت حضرت اسحٰق صغیر السن تھے۔
تم نے صغرِ سنّی کی دلیل یہ قرار دی ہے کہ انھوں نے اس وقت شادی نہیں کی تھی۔
لیکن یہ صغرِ سنّی کی کوئی دلیل نہیں۔ حضرت اسحٰق نے تو چالیس برس کی عمر تک شادی
نہیں کی، تو کیا تیس، پینتیس برس تک ان کو صغیر السن کہہ سکتے ہیں۔ خدا نے اسحٰقؑ کی
بشارت کے ساتھ کثرتِ نسل کی اگر بشارت دی، تو اس سے قربانی سے کوئی منافات
نہیں۔ ممکن ہے کہ شادی ہو جاتی، اور اولاد ہو جاتی، پھر وہ قربان کیے جاتے۔" [۲۴]

اسی لیے سیرت النبیؐ کی ذبیح کی بحث میں علامہ شبلیؒ نے مولانا فراہی مرحوم کی تقریباً پوری بحث قبول کرنے کے باوجود صغرِ سنّی کی دلیل شامل نہ کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکور مکتوب ۵۸ کے جواب میں مولانا فراہیؒ نے حضرت اسحٰقؑ کی صغرِ سنّی سے متعلق اور دلائل اور تورات کے حوالے لکھے ہوں گے، چنانچہ علامہ شبلیؒ نے اپنے مکتوب نمبر ۶۲، مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء میں لکھا:

"۔ ۔ ۔ ۔ ان آیتوں کا حوالہ لکھو جن میں قربانی کے لیے "بکر" ضروری ہے۔
بعض اور باتیں جو تم نے لکھیں ان کے حوالے نہیں نقل کیے۔" [۲۵]

اسی طرح مکتوب نمبر ۶۳، مؤرخہ ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء میں لکھا:

"۔ ۔ ۔ جس خط میں تم نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے پر آٹھ نو دلیلیں
لکھی تھیں، اس میں تورات کے نصوص نہیں نقل کیے۔ وہ لکھ بھیجو۔ ۔ ۔" [۲۶]

مکتوب نمبر ۶۹، ۲۲ نومبر ۱۹۱۳ء میں بھی حوالوں کے نہ ملنے کا ذکر ہے:

"۔ ۔ ۔ مجھ کو تکوین کی اصحاح ۱۱ میں عبارت کہیں نہ ملی۔ صفحہ ۱ پر تم نے لکھا
ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا مسکن صفا کی جانب تھا۔ پھر تکوین ۱-۸ کا حوالہ دیا ہے۔
لیکن تکوین میں صفا کا کوئی ذکر نہیں۔" [۲۷]

سورۂ تحریم کی تفسیر فراہی کے سلسلہ میں علامہ شبلیؒ کا طرزِ عمل پہلے واقعہ سے مختلف نظر آتا ہے۔ حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ کے مظاہرہ کے سلسلہ میں وہ اوّلاً مولانا فراہیؒ کی تحقیق سے متفق نہ تھے، چنانچہ ان کو مکتوب ۶۸، مورخہ ۳ نومبر ۱۹۱۳ء میں لکھتے ہیں:

"مظاہرہ کو سیاست سے کیا تعلق ہے؟ مفسّرین تو وہی نفقہ کا جھگڑا بتاتے ہیں۔ اس کو سیاست سے کیا تعلق ہے۔"[۴۸]

لیکن سیرت النبیؐ کی متعلقہ بحث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کی عمارت مولانا فراہی کی تحقیق و دلائل پر قائم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ابتدا میں اختلاف کے باوجود جب علامہ شبلیؒ مولانا فراہی کی تحقیق سے مطمئن ہوگئے تو پھر اس بات کو قبول کرنے میں کوئی مانع نہ رہا۔

ج۔ حاصلِ کلام

علامہ شبلی کی ان تمام خوردہ چینیوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلا تنقید و مقابلہ کسی بھی عالم و فاضل کی تحقیق قبول کرنے پر بالعموم آمادہ نہ ہوتے تھے۔ علمائے دین اور جویائے حق اہلِ بحث و تحقیق کا یہی طرزِ عمل ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتے ہیں، اس کو تعریف و تحسین و اعتراف کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ اور جس چیز کو صحیح نہیں سمجھتے اس کو نقد و جرح کی کسوٹی پر کس کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کی داد و تعریف تحسین ناشناس اور طرفداری غالب پر مبنی نہیں ہوتی۔ اور نہ ان کی تنقید و تبصرہ کورچشم و بدطینت دشمن کی مخالفت و عداوت پر منحصر ہوتا ہے۔

علامہ شبلیؒ بقول خود اختلاف و اتفاق کو ان کے اصلی حدود پر رکھنا جانتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے قرآنی تحقیقاتِ فراہی کے ان حصّوں کی بھرپور تعریف و توصیف کی جن کو وہ صحیح سمجھتے تھے، اور بوقتِ ضرورت ان سے اخذ و استفادہ میں حرج نہ سمجھا، اور جن آرا سے وہ متفق نہ ہوئے اور علمی طور پر ان کو غیر صحیح سمجھا، ان کو دلیل سے رد کیا اور خوش اسلوبی سے ان پر متنبہ کیا۔ اسی لیے میزانِ شبلی میں تحقیقاتِ فراہی کو تولنے کے بعد دونوں پلڑے اپنی اپنی جگہ متوازن نظر آتے ہیں۔ اور اسی لیے تمام مذکورہ ردّ و قدح اور نقد و جرح کے باوجود نگاہِ شبلی میں

تحقیقاتِ فراہی کی نہ اہمیت کم ہوئی اور نہ کسی صاحبِ علم و دیانت کی نظر میں کم ہوسکتی ہے۔

مولانا فراہی کی فکرِ قرآنی نے بلاشبہ اپنے معاصرین، جانشینوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کو متاثر کیا ہے، اور قرآن عظیم کی تفسیر و فہم پر کام کرنے والوں کو ہمیشہ متاثر کرتی رہے گی۔ تاہم ان سے کلّی اتفاق کرنا اور ان کی تحقیقات کے ہر ہر جزئیہ کو تسلیم کرنا ناممکن بلکہ محال ہے۔ آج تک ایسا نہ کسی مصنف و مؤلف کے ساتھ ہوا ہے، اور نہ کبھی آئندہ ہوگا۔ خود مولانا فراہیؒ نے متعدد بزرگانِ سلف اور علمائے امت سے اختلاف کیا ہے اور ان کے نمایاں شاگردوں نے بھی ان سے بہت سے مسائل و آرا پر اتفاق نہیں کیا ہے۔ اختلاف و عدم اتفاق سے کسی کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی۔ بشریت کے ناطے ہر مصنف و مؤلف اور ہر صاحبِ فکر و نظر کے ہاں بھول ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے علمی اختلاف کرنے کا ہر صاحبِ علم کو بشرطِ تقویٰ اور دیانت حاصل ہے۔ اختلاف کا حق اگر نہیں حاصل ہے تو صرف اللہ رب العٰلمین کے کلامِ صحیح اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کے باب میں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

اللّٰھم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

حواشی و حوالے

۱ شبلی نعمانی، خطباتِ شبلی، مرتب سید سلیمان ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۵ء، ص ۳۳

۲ ایضاً۔ ص ۴۶-۲۸، علامہ مرحوم کا یہ خطبہ اس موضوع پر معرکۃ الآرا مواد رکھتا ہے۔

۳ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، مرتب سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۸ء، دوم، ص ۱۸-۱۳

۴ ایضاً۔ ۱۹۵۴ء، اول، ص ۴۵-۳۸

۵ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، مرتب سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۷ء، دوم ص ۱۲-۱۱

مرتب نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "اس کی تفسیر اب ناپید ہے امام رازی کی تفسیر کبیر میں اس کے

جستہ جستہ فقرے منقول ہیں۔"

۶؎ ایضاً۔ دوم ص ۱۳ ۷؎ ایضاً۔ دوم ص ۱۴

۸؎ ایضاً۔ دوم ص ۵۔۱۴، مورخہ یکم جون ۱۹۰۳ء، از حیدرآباد۔ مرتب نے حاشیہ میں لکھا ہے: "یعنی نمونہ کے لیے نظام القرآن کے بعض اجزا، مصر کے رسالہ المنار میں بھیج دو۔ اس کے چند سال بعد شاید ۱۹۱۰ء یا اس کے حوالی میں مصنف نے چند اجزا بھیجے تھے۔ سید رشید رضا، صاحب المنار نے مصنف کو بڑی داد دی تھی، اور المنار میں اس پر مفصل تقریظ لکھی تھی۔"

۹؎ ایضاً۔ دوم ص ۱۵۔

۱۰؎ ایضاً۔ دوم ص ۲۰ مورخہ ۳؍ جون ۱۹۰۵ء از لکھنؤ

۱۱؎ ایضاً۔ دوم ص ۲۳ و ۲۴، حاشیہ ۲، ان کی تاریخ بالترتیب ۴؍ اپریل ۱۹۰۶ء، اور ۴؍ اگست ۱۹۰۶ء ہے۔ پہلے مکتوب کا مقام کتابت غیر مذکور ہے، جب کہ دوسرے کا بمبئی ہے۔

۱۲؎ ایضاً۔ دوم ص ۲۶۔۲۵، مورخہ ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۰۶ء اور ۱۲؍ دسمبر ۱۹۰۶ء بالترتیب مقام ارسال دونوں میں مذکور نہیں۔

۱۳؎ ایضاً۔ دوم ص ۳۷، مورخہ ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء، مقام کتابت مذکور نہیں۔ گویا یہ خط ۶ سال کے وقفہ کے بعد تفسیر فراہی کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔

۱۴؎ ایضاً۔ دوم ص ۴۵، مورخہ ۱۹۱۳ء از حیدرآباد، غالباً ۱۹۱۳ء کا خط ہے۔

۱۵؎ ایضاً۔ دوم ص ۴۸ مورخہ ۱۲؍ نومبر ۱۹۱۳ء از حیدرآباد۔

۱۶؎ اس پوری بحث کے لیے ملاحظہ ہو محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مقالہ "سیرت النبی شبلی میں فکر فراہی"، پیش کردہ امام فراہی سمینار، سرائے میر، ۸۔۱۰؍ اکتوبر ۱۹۹۱ء

۱۷؎ مقالات شبلی، دوم ص ۱۴

۱۸؎ مکاتیب شبلی، دوم ص ۱۳۔ مرتب نے مولانا فراہی کی تفسیر نظام القرآن پر حاشیہ میں مختصراً تعارف پیش کیا ہے۔

۱۹؎ ایضاً دوم ص ۱۵۔۱۴، مکتوب ۱۹، ۲۰

۲۰؎ ایضاً۔ دوم ص ۲۰۔۱۹، مورخہ ۵؍ اپریل ۱۹۰۵ء از اعظم گڑھ۔ اسی خط میں علامہ شبلیؒ نے

ارسطو پر تنقید فراہی سے بھی تعرض کیا ہے، اور اپنے مضمون پر تنقید مکتوب الیہ سے بھی۔

۲۱؎ ایضاً۔ دوم ص ۲۰، مکتوب ۲۸، مورخہ ۳؍ جون ۱۹۰۵ء از لکھنؤ

۲۲؎ ایضاً۔ دوم ص ۲۴، مورخہ ۴؍ اگست ۱۹۰۶ء از بمبئی

۲۳؎

۲۴؎ مکاتیب شبلی۔ دوم ص ۳۹۔۳۸، مورخہ ۱۳؍ نومبر ۱۹۱۲ء، نیز ملاحظہ ہو جامع مکاتیب کا توضیحی حاشیہ ۱

۲۵؎ ایضاً۔ دوم ص ۴۱، مورخہ ۲۰؍ اگست ۱۹۱۳ء از بمبئی

۲۶؎ ایضاً۔ دوم ص ۴۳، مورخہ ۸؍ ستمبر ۱۹۱۳ء از بمبئی

۲۷؎ ایضاً۔ دوم ص ۴۹، مورخہ ۲۲؍ نومبر ۱۹۱۳ء، غالباً از حیدرآباد

۲۸؎ ایضاً۔ دوم ص ۴۷، مورخہ ۳؍ نومبر ۱۹۱۳ء، از حیدرآباد